علامہ اقبال سے متعلق خصوصی انٹرویو (۲)

* ایم - ایس ناز

مولانا غلام مرشد

س :- مولانا - موجودہ دور میں آپ کی ذات گرامی تاریکیوں میں روشنی کے مصداق ہے - اس لئے ہم آپ سے علامہ اقبال سے آپ کی ملاقاتوں کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتے ہیں، یہ ملاقاتیں کب شروع ہوئیں اور کب تک جاری رہیں ؟

ج: - علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ سے میری اولین ملاقات ۱۹۲۱ء میں ہوئی- اس کا پس منظر یہ ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد ترکوں پر جو بے پناہ مظالم ڈھائے گئے اور شیخ کویت نے تمام عرب ممالک کو اپنا ہم خیال بناتے ہوئے، انگریزوں کی فریب کاریوں میں آکر ترکی کی وسیع ترین مملکت کا خاتمہ کر دیا، تو اس سرزمین میں شیخ سنوسی علیہ رحمۃ ایک ایسی ہستی تھے، جنھوں نے بار بار عرب ریاستوں کو ان ہولناک نتائج سے آگاہ کیا، مگر ان پر انگریزوں کی حمایت کا جنون کچھ اس طرح سے سوار تھا کہ حضرت شیخ سنوسی علیہ رحمۃ کی مجاہدانہ اور مصلحانہ تحریک ناکام ہوگئی، جس کو اس وقت حضرت علامہ نے ایک شعر میں یوں بیان کیا :-

کیا خوب امیر فیصل کو سنوسی نے پیغام دیا
تو نام ونسب(۱) کا حجازی ہے پر دل کا حجازی بن نہ سکا

---

(۱) مولانا غلام مرشد کے بقول اس شعر کا مصرعہ ثانی ابتدا میں یوں تھا کہ
تو چمڑے کا تو حجازی ہے، پردل کا حجازی بن نہ سکا
شاید چمڑے ، کے لفظ سے زیادہ تلخی نمایاں ہوتی ہو، اس لئے بعد میں اس کی جگہ نام ونسب، کی ترمیم کردی گئی، مولانا نے اس مصرعہ ثانی کو ابتدائی صورت ہی میں پڑھا -

اس بے پناہ صدمے سے متاثر ہوکر متحدہ ہندوستان میں تحریک خلافت شروع ہوئی، جس کے بہت بڑے سرپرست حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ پنجاب خلافت کمیٹی کے صدر مولانا عبدالقادر قصوری تھے، جو بے حد مخلص تھے۔ صدر محترم کے اس خلوص کی بدولت خاکسار غلام مرشد کو تحریک خلافت کی پنجاب ورکنگ کمیٹی کی رکنیت کا شرف حاصل ہوا اور جب ڈاکٹر کچلو گرفتار ہوئے تو خاکسار کو ان کی جگہ نائب صدر بنایا گیا۔ تحریک خلافت کی مقبولیت بڑے شہروں اور قصبوں کے علاوہ دیہاتوں کے گلی کوچوں میں بھی پھیل گئی تو متحدہ ہندوستان میں اعلیٰ مناصب رکھنے والے مسلمان اور امیدوار انگریز کے آلہ کار بن کر اس مقبول ترین تحریک کو ناکام بنانے کے لئے میدان میں آگئے اور ترکوں کے خلاف مضامین کا سلسلہ شروع ہوگیا، یہاں تک کہ سرکاری اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ (Civil & Military Gazette) میں ان کے بیانات بکثرت شائع ہونے لگے۔ ان خطاب یافتہ بزرگوں کا بڑا حربہ یہ تھا کہ خلیفہ ہونے کے لئے قریشی ہونا ضروری ہے اور چونکہ ترک قریشی نہیں ہیں، اس لئے وہ خلافت کے اہل نہیں ہیں۔ ان خطاب یافتہ یا امیدواران خطابات نے اس حدیث کو ڈھال بنایا ''الائمۃ من قریش،،۔ اس حدیث کو اخبار 'سول اینڈ ملٹری گزٹ، نے اپنے اداریہ (Editorial) کا عنوان بنایا، جس کو پڑھ کر حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے پنجاب خلافت کمیٹی کے معزز صدر سے ارشاد فرمایا کہ اس کا مسکت جواب کسی کتاب و سنت کے جاننے والے سے لکھوا کر اخبار کو بھیجا جائے اور اس ضمن میں ایک جلسہ عام بھی منعقد کیا جائے۔ میری خوش‌قسمتی تھی کہ علامہ اقبال اور مولانا عبدالقادر قصوری نے یہ ذمہ داری میرے سپرد کی۔

س:۔ اس وقت تک آپ کی حضرت علامہ سے بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی تھی؟

ج:- جی نہیں ۔ ابھی مجھے ان سے براہ‌راست ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا تھا، ویسے حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ مجھے ایک دوست شیخ گلاب دین کے توسل سے خوب جانتے تھے، جن کے مکان میں وہ کرایہ دار کی حیثیت سے رہ چکے تھے۔ ان کے علاوہ ان کے ایک اور دوست شیخ احمد وکیل بھی میرے درس میں باقاعدگی سے آتے تھے اور یوں علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ مجھے بالواسطہ طور پر اچھی طرح سے جانتے تھے۔

س:- آپ فرما رہے تھے کہ پنجاب خلافت کمیٹی کے صدر نے حضرت علامہ کے اشارے پر یہ ذمہ‌داری آپ کو تفویض کی کہ آپ،'سول اینڈ ملٹری گزٹ، میں شائع ہونے والے بیانات و اعتراضات اور اداریہ میں اٹھائے گئے نکات کا جواب لکھیں ۔؟

ج:- جی ہاں۔ اس پر خاکسار نے ان سے ایک ہفتہ کی مہلت مانگی اور عرض کیا کہ آپ جلسہ کے انعقاد کی تیاری جاری رکھیں اور ادھر مجھے کم از کم سات روز دئے جائیں کہ میں کوئی مسکت اور سیر حاصل جواب لکھ سکوں اور پھر اس جواب کہ مجوزہ جلسہ عام میں بھی پڑھ کر سناؤں۔ چنانچہ انھوں نے میری بات مان لی۔ ٹھیک ایک ہفتہ کے بعد مقررہ وقت پر طے شدہ پروگرام کے عین مطابق ایک عظیم جلسہ باغ بیرون لوہاری دروازہ منعقد ہوا اور شاہ عالمی دروازہ سے بھاٹی دروازہ تک لوگوں کا ہجوم ہی ہجوم تھا۔ اس جلسہ میں سٹیج پر دیگر اخبار نویسوں میں ہمارے مخالف و مہربان اخبار 'سول اینڈ ملٹری گزٹ، کے ایڈیٹر بھی معہ اپنے رپورٹر کے موجود تھے۔ جلسہ کا انتظام مولانا غلام محی‌الدین قصوری کے ذمے تھا، جنھوں نے اپنی ذمہ‌داریوں کو بہ احسن طریق نبھایا اور یہ جلسہ ایک تاریخی اجلاس کی حیثیت اختیار کر گیا۔ شروع کے مقرروں میں مجھے بلایا گیا اور میں نے حدیث :

'الائمة من قریش، کے موضوع پر اظہار خیال کیا، جس کا خلاصہ ہے کہ یہ حدیث درایتاً صحیح ہے نہ روایتاً - درایتاً اس لئے کہ یہ قرآن کی آیت استخلاف کے خلاف ہے، چوبیس آیات اس کے خلاف ہیں - اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے۔

وعد اللہ الذین آمنوا منکم و عملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الأرض کما استخلف الذین من قبلھم و لیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم و لیبدلنھم من بعد خوفھم امنا یعبدوننی لا یشرکون بی شیئا و من کفر بعد ذالك فاولئك ھم الفاسقون . (۱)

(ترجمہ) تم میں جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں، ان سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ان کو اس اتباع کی برکت سے حکومت عطا فرمائے گا، جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی اور جس دین کو ان کے لئے پسند فرمایا ہے، اس کو ان کے لئے قوت دے گا اور ان کے اس خوف کے بعد اس کو مبدل بہ امن کر دے گا، بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور اس کے بعد جو ناشکری کرے گا تو یہ لوگ بے حکم ہیں -

اس آیت میں سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مخلص غلاموں سے خلافت کا وعدہ کیا گیا ہے اور اس میں قریش و غیر قریش اور عربی و عجمی کی کوئی تمیز روا نہیں رکھی گئی - میں نے جلسہ عام میں کہا کہ پیغمبر کو بھی جب یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ خدا کے احکامات میں تبدیلی کرے، تو پھر کسی کو یہ جرأت نہیں ہولی چاہئے کہ وہ ایسی احادیث کو بیان کرے، جو درایتاً صحیح نہ ہوں — اور پھر

---

۱ - سورة نور آیت ٥٥

میں نے یہ بھی کہا کہ مذکورہ حدیث روایتاً اس لئے بھی غلط ہے کہ اس کی جو سندات خاکسار کی نظر سے گزری ہیں، وہ اور ان کے راوی اس معیار پر پورا نہیں اترتے۔ جو حضرت امام بخاری علیہ رحمۃ نے مقرر کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ نہ صرف امام بخاریؒ نے، بلکہ امام مسلمؒ تک نے اس حدیث کو درج نہیں کیا۔

دلائل و براھین کی کثرت کے باعث میری تقریر کافی طویل ہوگئی، تاآنکہ میں نے مولانا قصوری صاحب کے بار بار اصرار پر اپنا بیان ختم کردیا۔

دوسرے روز 'سول اینڈ ملٹری گزٹ، سمیت تمام اخبارات میں اس جلسہ کی کارروائی شائع ہوئی، تو یہ بات میرے لئے بھی نہایت حیران کن تھی کہ میری مکمل تقریر شامل اشاعت تھی، حضرت علامہ نے اسے پڑھا، تو اپنے دوست محمد دین تاثیر کو میرے ہاں بھیجا۔ انہوں نے آکر مجھے پیغام دیا کہ علامہ یاد فرمارہے ہیں۔ میرے لئے یہ مسرت کا مقام تھا۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت وہ اپنی آرام کرسی پر تشریف فرما تھے۔ ایک والہانہ جوش اور جذبہ کے ساتھ اٹھے اور دیوانہ وار مجھے گلے لگا لیا۔ پھر میری پیشانی کو بوسہ دیا اور فرمایا: میں تمہیں مولوی کی بجائے آج سے بدو مولوی کا لقب دیتا ہوں اور وہ مجھے رحلت تک 'بدو مولوی، ہی کہہ کر یاد کرتے رہے۔

کیا اس وقت علامہ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں رھائش پذیر تھے؟

جہاں تک میری یاد داشت کام کرتی ہے، اس وقت آپ میرے قریب ھی شیخ گلاب دین کے مکان واقع بھاٹی دروازہ، میں رھتے تھے اور شاید میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

س:- حضرت علامہ سے یہ آپ کی پہلی بالمشافہ ملاقات تھی؟

ج:- ہاں۔ یہ پہلی بالمشافہ ملاقات تھی، جس کی تھوڑی بہت تفصیل مجھے آج بھی یاد ہے کہ اس ملاقات میں حضرت علامہ نے اس تقریر پر کافی دیر تک میرے ساتھ گفتگو کی اور فرمایا کہ تمہارا یہ کہنا بجا ہے کہ امام ابو الحسن اشعری سے لے کر شاہ ولی اللہ دھلوی تک جن متکلمین حضرات نے اس حدیث کو درج کیا ہے، ان کے اندراج کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اخبار 'سول اینڈ ملٹری گزٹ، کو چاہئے کہ ان لوگوں کو زیادہ سے زیادہ انعام کی پیشکش کرکے یہ اعلان کرے کہ محمود غزنوی کی سلطنت میں کوئی ایسا مرد قلندر تھا، جس نے یہ سوال اٹھایا کہ خلافت یا حکومت کے حقدار صرف اور صرف قریش ہیں؟ شاہ ولی اللہ کے دور میں مغلوں کی حکومت تھی، لیکن انھوں نے بھی ایسی کوئی تحریک شروع نہ کی کہ خلافت کا حقدار کون ہے۔؟ میں نے حضرت علامہ سے عرض کیا کہ ان متکلمین حضرات کی جو کتاب بھی آپ اٹھائیں گے، ان میں سے ہر ایک میں باقاعدہ ایک فصل ملے گی، ایک باب اس عنوان کے تحت ملے گا کہ: 'الائمۃ من قریش،۔ یہ بات خود ان کے عمل کے خلاف تھی۔ میں آج بھی یہ بات ببانگ دھل کہوں گا کہ جو لوگ ایک عقیدے کو عام مسلمانوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور خود اس پر عمل پیرا نہیں ہوتے، انھیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اس قسم کا وعظ کریں۔

حضرت علامہ نے اس موقع پر مجھ سے ایک بڑا دلچسپ اور فکر انگیز سوال کیا کہ لوگ تو یہ کہیں گے کہ تم بڑے عالم ہو یا وہ بڑے عالم تھے۔؟ میں نے انکسارانہ لہجے میں عرض کیا: میں تو کوئی عالم نہیں ہوں، فقط ایک طالب علم ہوں، لیکن بہر حال جن لوگوں نے

متکلمین ہونے کی حیثیت سے (خلافت قریش کے بارے میں) کتابوں میں لکھا ہے، خواہ وہ شرح عقائد ہو، یا شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ، خواہ سید شریف جرجانی کی شرح مواقف ہو یا علامہ تفتازانی کی شرح مقاصد، ان میں سے بعض لوگ وہ ہیں، جو تاتاریوں کے دور حکومت میں پیدا ہوئے اور ان ہی کے عہد میں انھوں نے زندگی گزاری، ان کے رحم و کرم سے ان لوگوں کو حدیثیں اور دیگر کتابیں لکھنے کا موقع ملا، حیرت کی بات ہے کہ وہ لوگوں کو درس تو دیتے تھے (قریش کا) اور خود غیر قریش حکومت کے ماتحت زندگی گزارتے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ جب امام ابو الحسن اشعری سے لے کر شاہ ولی اللہ دہلوی تک کسی نے اس حدیث کی آڑ لے کر تحریک شروع نہ کی تو موجودہ دور میں بھی ان خطاب یافتہ بزرگوں کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس پر حاشیہ آرائی کریں اور اسلامی اتحاد کو نقصان پہنچائیں۔

کافی دیر تک حضرت علامہ سے اس موضوع پر گفتگو ہوتی رہی اور وہ خاموشی سے میری باتیں سنتے رہے۔ آخر میں فرمایا کہ تمھیں اس تقریر سے نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔ حضرت علامہ کا یہ اندیشہ حرف بہ حرف درست تھا، کیونکہ میں جس دارالعلوم میں صدر تھا، اس کا ایک ایک رکن خلافت کمیٹی کے خلاف تھا۔

س:۔ آپ کا اشارہ کس دارالعلوم کی طرف ہے؟

ج:۔ دارالعلوم نعمانیہ ہند، جہاں سے ۱۹۲۶ء میں، میں استعفیٰ دے کر چلا آیا۔ اس استعفیٰ کی وجہ دراصل اظہار وجوہ کا وہ نوٹس تھا، جو محرم علی چشتی اور تاج دین ایڈووکیٹ نے دارالعلوم کی طرف سے میرے نام جاری کیا۔ ان ہر دو اصحاب نے مجھ سے سوال کیا کہ آپ کو اس طرح کی

تقریر نہیں کرنی چاہئے تھی۔ میں نے انھیں باور کرانے کی کوشش کی کہ میں نے یہ مضمون اپنے فارغ وقت میں لکھا ہے اور پھر اس پر تقریر کی ہے، لیکن 'دارالعلوم' کے فرائض سے میں نے ہرگز اغماض نہیں برتا، لیکن وہ لوگ مجھے ملازمت سے سبکدوش کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے، لہذا میں نے استعفا دے دیا اور فارغ الذہن ہوکر اونچی مسجد الدرون بھاٹی گیٹ چلا آیا اور یہاں درس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ علامہ اقبال کو جب اس صورت حال کا علم ہوا، تو انھوں نے فرمایا : اس میں فکر کی کوئی بات نہیں، حق بات کہنے اور لکھنے کی پاداش میں انسان کو ایسی کئی قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ دارالعلوم کی ملازمت سے فراغت کے بعد مجھے علامہ سے ملاقاتوں کے لئے زیادہ وقت میسر آنے لگا اور اب میرا زیادہ وقت ان کی صحبتوں میں گزرتا تھا۔

س :- حضرت علامہ سے آپ کی آخری ملاقات کب ہوئی ؟

ج :- وصال سے ایک ہفتہ پہلے تک حضرت علامہ سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ آخری ملاقات، ان کی رحلت سے چند یوم پہلے ہوئی، جب انھوں نے مجھے م۔ش کے توسل سے پیغام بھیجا کہ ملاقات کے لئے آؤ۔ اس وقت وہ بستر مرگ پر دراز تھے۔ میں حاضر ہوا، علالت کے باوجود تپاک سے ملے، م۔ ش سمیت سب لوگوں کو کمرے سے نکل جانے کی استدعا کی اور آخر میں اپنے خاص خادم علی بخش کو بھی باھر چلے جانے کو کہا۔ پھر مجھے بستر پر پاس بٹھالیا۔ سرھانے پڑا ہوا قرآن شریف اٹھایا اور سورۃ 'النجم' کے اوراق کھول کر فرمانے لگے کہ میں اس سورۃ کی پہلی تین آیات کی تفسیر کے متعلق بیشتر علماء کرام سے استفسار کر چکاھوں، مگر مجھے تسلی و تشفی نہیں ہوئی۔ بالآخر آپ کو زحمت دی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ان کی تفسیروں سے

آپ کو تسلی و تشفی ہو ہی نہیں سکتی۔ تب میں نے پہلے یہ تین آیات پڑھیں: والنجم اذاھوی . ماضل صاحبکم وما غوی . وما ینطق عن الھوی .

میں نے عرض کیا کہ نجم کے معنی جہاں کوکب، ستارے، پودے بیل یا شجر کے ہیں، وہاں اس کے معنی حصہ کے بھی ہیں۔ 'ھوی' کے معنی اگر گرنے کے ہیں تو اترنے کے بھی ہیں۔ حضرت علامہ نے فرمایا: ٹھیک ہے۔ تب میں نے عرض کیا کہ اس آیت کی تشریح یوں ہے: گواہ ہے ہر حصہ قرآن کا، جب اترتا ہے وہ، یعنی گواہی دیتا ہے تیری صداقت پر۔ اب سوال یہ ہے کہ کس بات کی شہادت دیتا ہے؟ 'ماضل صاحبکم' صاحب سے مراد یہاں رسول پاک ہیں کہ وہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) تم جیسے بدترین بدکاروں میں چالیس برس رہنے کے باوجود کبھی برائی اور بدکاری کے مرتکب نہ ہوئے۔ 'غوی' بداعتقادی کو بھی کہتے ہیں اور 'وما ینطق عن الھوی' سے مراد ہے کہ: گواہ ہے ہر حصہ قرآن کا جب اترتا ہے وہ کہ آپ (رسول اللہ صلعم) نے کبھی بدزبانی کا ارتکاب نہ کیا، گوکہ آپص سالہا سال، صبح، شام، سفر، حضر میں بھی بدترین لوگوں، بد اعتقادوں اور بدکاروں کی صحبت میں رہے۔ یہ قرآن کہتا ہے، کہ جو بروں کی صحبت میں بیٹھے گا برا ہوجائے گا۔عام دنیا میں یہی ضابطہ ایک ضرب المثل کے طور پر مشہور ہے، لیکن اللہ اللہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہی ایسی تھی جو اس سے مستثنیٰ رہی اور آپص کا دامن ہر قسم کی چھوٹی بڑی برائی، اور بدزبانی سے پاک رہا۔ اور قرآن کا ہر حصہ اس بات کی شہادت دیتا ہے۔

حضرت علامہ انتہائی یکسوئی اور غور سے سورہ 'النجم' کی ان

تین آیات کی تفسیر کے مطالعہ میں محو تھے اور پھر رقت آمیز لہجے میں فرمایا : یہ حقیقت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار او تقدس کی صفائی اور گواہی قرآن ہی نے پیش نہیں کی بلکہ خالق کائنات نے ظہور قدسی سے پہلے ان کی فطرت کو ایسے سانچے میں ڈھالا تھا کہ آپ ہر نوع کی آلائشوں سے محفوظ و مامون رہے ۔ قرآن کے ذریعے تو فقط لوگوں کو بتانا مقصود تھا اور حضور کی صداقت بعینہ قرآن کی صداقت ہے ۔ علامہ کے لبوں سے حضور کا ورد جاری تھا، اور ان کی نگاہیں اشکبار تھیں ۔ وہ حقیقتاً سچے عاشق رسول تھے ۔

اسی صحبت میں، میں نے حضرت علامہ کی خدمت میں سورہ 'النجم کی ان آیات کا پس منظر بیان کرنے کے لئے ابن عباس کی تشریح بیان کی کہ : حق تعالیٰ قرآن حکیم کی قسم اٹھا کر فرماتا ہے کہ قرآن حکیم کو بذریعہ جبرئیل امین، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قسط وار، ایک ایک دو دو، تین تین اور چار چار آیتیں کرکے پورے بیس سال میں نازل کیا گیا، اور جب عتبہ بن ابی لہب نے سنا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن حکیم کے حصوں کی قسم کھاتے ہیں، تو بولا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تک یہ بات پہنچا دو کہ میں قرآن کریم کے حصوں کا منکر ہوں ۔ جب لوگوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ بات پہنچائی تو آپ نے فرمایا کہ اے رب العالمین اپنے درندوں میں سے کوئی درندہ اس پر مسلط کردے ۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے حران کے قریب ایک شیر کو اس پر مسلط کر دیا، جس نے اس کے ساتھیوں سے نکال کر قرب و جوار میں لے جا کر سر سے لے کر پاؤں تک چیر پھاڑ ڈالا، لیکن اس کی نجاست کے باعث اس نے چکھا تک نہیں ۔ (۱)

---

۱ - تفسیر ابن عباس ج ۳ ص ۲۲۸

:- اقبال کے بعض شیدائیوں کا بیان ہے کہ حضرت علامہ خود قرآن حکیم کی تفسیر لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ کیا آپ سے بھی اس موضوع پر کبھی گفتگو ہوئی ؟

- میرے ساتھ خصوصیت سے انھوں نے اس موضوع پر کسی قسم کا اظہار خیال تو نہیں کیا تھا، تاہم یہ امر ان کے اس عزم کی طرف ایک بلیغ اشارہ ہے کہ وہ ہر ملاقات میں قرآن کی کسی نہ کسی آیت کے متعلق خلوت میں اور بسا اوقات اپنے بعض مداحوں مثلاً ڈاکٹر محمد دین تاثیر، م۔ش، اور ڈاکٹر عبداللہ چغتائی وغیرہ کی جلوت میں مجھ سے مخاطب ہوکر سیر حاصل گفتگو فرماتے تھے۔ اس ضمن میں کوئی ایک آیت پڑھ کر ان کا سب سے پہلا سوال یہی ہوتا تھا کہ اس آیت کے مفہوم کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟ اور مجھے اس بارے میں جو کچھ معلوم ہوتا، اپنی علمی استعداد کے مطابق عرض کر دیتا اور اگر مزید وضاحت کی ضرورت محسوس ہوتی تو بعض کتب کے حوالے دیکھنے کی خاطر دوسرے روز کی مہلت طلب کر لیتا۔ جتنا عرصہ میں ان کی صحبتوں سے مستفید ہوتا رہا، میں نے اندازہ لگایا کہ حضرت علامہ عالم شباب ہی میں محسوس کر چکے تھے کہ اگر اسلام کو ایک ضابطہ کی حیثیت سے عصر حاضر میں کامیاب اور آبرومند بنانا ہے تو اس کا طریقہ یہی ہے کہ زمانہ حال کے جورس پروڈنس (Jurisprudence) یعنی اصول قانون کی روشنی میں شرع اسلامی کے اساسات دنیا کے سامنے پیش کئے جائیں اور دلیل و برہان سے اصول فقہ اسلامی کی برتری آج کل کے قانون پر ثابت کی جائے۔ میں نے بعد میں کہیں پڑھا کہ ان کی مجوزہ کتاب کا نام تھا (Construction of Islamic Jurisprudence) اور انھوں نے بارہا اس ارادے

کا بھی اظہار کیا تھا کہ وہ ایک کتاب لکھیں گے (Islam as I understand)

اگر حضرت علامہ رحمة اللہ علیہ قرآن حکیم کی تفسیر لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے، جیسا کہ آپ نے ان کے بعض شیدائیوں کے حوالے سے سوال کیا ہے، تو میری ذاتی رائے میں اسلام کے موضوع پر وہ متذکرہ کتابیں بعد میں لکھنے کا ارادہ رکھتے ہوں گے تاہم یہ امر یقینی ہے کہ مدت دراز سے ان کے ذہن میں یہ تجویز گردش کر رہی تھی کہ ایک علمی مرکز قائم کیا جائے، جہاں دینی و دنیاوی علوم کے ماہرین جمع کئے جائیں، جنھیں خورد و نوش کی فکر سے بالکل آزاد کردیا جائے، تاکہ وہ ایک پر سکون گوشے میں بیٹھ کر یکسوئی کے ساتھ اسلام، تاریخ اسلام، تمدن اسلام، ثقافت اسلامی اور شرع اسلام کے متعلق ایسی ایسی کتابیں مدون کر سکیں، جو دنیائے فکر میں ایک انقلاب برپا کر سکیں۔

س :- مولانا، آپ ان کی شاعری کے کس پہلو کو نمایاں طور پر محسوس کرتے ہیں ؟

ج :- ہر شاعر کی اپنی ایک انفرادیت ہوتی ہے۔ وہ ایک خاص اسلوب رکھتا ہے یا ایک مخصوص رنگ کے تابع ہوتا ہے، جس سے اس کی عظمت و شوکت آشکارا ہوتی ہے۔ اس رنگ اور اسلوب سے بغاوت کرکے وہ اپنا وقار قائم نہیں رکھ سکتا۔ لیکن جہاں تک میں نے ان کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے، وہ ایک ہمہ جہتی شاعر ہیں، غزل گو ہیں، قصیدہ خواں بھی، مناظر قدرت اور مظاہر فطرت کے پرستار ہیں اور کشور دل کی تباہی و بربادی کے سوگوار اور ماتم دار بھی۔ وہ حمد و نعت کہنے کے علاوہ زندگی کے مسائل سے بحث کرتے ہیں اور فلسفہ کی گتھیاں بھی سلجھاتے

ھیں۔ اقبال کو میں نے جس رنگ میں بھی دیکھا ہے وہ یکتائے روزگار دکھائی دئے ھیں۔

علامہ اقبال نے جو زمانہ پایا، وہ متقدمین اور متاخرین کو نہیں ملا، جس زمانہ سے اقبال نبرد آزما رہے، اس کے مزاج شناس ان کے پیش رو تھے نہ ھمعصر۔ میرے نزدیک ان کے افکار کی وسعت کا یہی نمایاں پہلو ہے کہ انھوں نے عصر خویش سے اعلان جنگ کیا اور دم آخر تک لڑتے رہے۔ ان کے تیور بدلے نہ عزم و حوصلہ میں کوئی فرق آیا۔ ان کے جوش پیکار اور شوق رزم میں ولولہ انگیزی کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس زمانہ کو، اس کے اقتضاء کو اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے۔ ان کا دل آزاد تھا، ذھن، طبع اور مزاج میں حریت پسندی تھی۔ وہ زندگی بھر غلامی کے خلاف صف آراء رہے، ذھنی غلامی کو جائز سمجھا نہ جسمانی غلامی کو، انھوں نے جو کچھ دیکھا، اپنی آنکھوں سے دیکھا، جو کچھ سنا، اپنے کانوں سے سنا، جو کچھ سوچا اپنے ھی ذھن سے سوچا اور جو فیصلہ کیا، اپنے ھی دل سے کیا۔ افکار و خیالات اور نظریات و تصورات کی دریوزہ گری انھوں نے کبھی نہ کی اور مجھے ان کی شخصیت اور افکار کا یہی پہلو سب سے زیادہ پسند ہے۔ یہ بات کس قدر افسوسناک ہے کہ اکثر لوگ اقبال کی شاعری اور ان کے افکار کی اصل روح کو نہیں سمجھتے اور ان کے کلام کو محض شاعری سمجھ کر پڑھتے ھیں۔ اس کی طرف خود اقبال نے بھی پیش گوئی فرمائی تھی کہ لوگ میری شاعری کا مطلب اور مقصد نہیں جانتے، میں بتاتا ھوں کہ میری شاعری، میرے دل کی وہ آواز ہے، جس نے ذرہ بے مایہ میں زندگی کی تڑپ پیدا کی اور وہ آمادۂ جہاد ہے ذوق نمو اور شوق ظہور سے بیتاب ھوا جا رھا ہے:

مثل شرر ذرہ را تن بہ تپیدن دھم
تن بہ تپیدن دھم، بال پریدن دھم

اقبال کا ایک ناکردہ گناہ یہ بھی ھے کہ انھوں نے اپنا ایک حلقہ سخن بنایا اور اس میں بیٹھ کر عہد حاضر کی فریب کاریوں اور طلسم بندیوں کے خلاف اعلان جہاد کرتے رھے اور کچھ ایسے لوگ پیدا ھوگئے، جو ان کی بات سنتے تھے، اس پر کان دھرتے تھے اور صف بستہ ھونے کی تیاریوں میں رھتے تھے، ان کا اپنا شعر ھے :

ترا گناہ ھے اقبال مجلس آرائی
اگرچہ تو ھے مثال زمانہ کم پیوند

اور یہ ان کی نوائے پریشاں کا اثر تھا کہ غلاموں میں جذبہ حریت بیدار ھوگیا، جو غلامی پر قناعت کر چکے تھے اور جنھوں نے ذلت و خواری کی زندگی کو اپنا لیا تھا اور جو اپنی شکستہ پری پر خورسند و مسرور تھے، وہ فضائے نیلگوں میں اڑنے کے لئے بیتاب ھوگئے، ان میں شوق پرواز پیدا ھو گیا :

تڑپ رھے ھیں فضائے نیلگوں کے لئے
وہ پر شکستہ کہ صحن سرا میں تھے خورسند

آج اقبال کا یہ شعر خود ان کی زندگی پر صادق آرھا ھے کہ :

اگر جہاں میں مرا جوھر آشکار ھوا
قلندری سے ھوا ھے تونگری سے نہیں

اللہ اللہ ! کیا فکر کی وسعت اور بلندی ھے کہ اقبال کہتے ھیں : اگر دنیا میں میرا جوھر آشکار ھوا ھے اور لوگ مجھے سر آنکھوں پہ بٹھاتے ھیں، میری قدر و منزلت کرتے ھیں، میری عظمت کے معترف یا میری

بڑائی کے قائل ہیں تو اس لئے کہ میں تونگر نہیں ہوں، بلکہ قلندر ہوں۔ مقصود کہنے کا یہ ہے کہ جو شخص زر و دولت پر حریصانہ نگاہیں نہیں رکھتا، ایمان و ضمیر کا سودا نہیں کرتا وہ قلندر کے راز کو پالیتا ہے۔

۔ آپ کے خیال میں اقبال کا پیغام (nutshell) میں کیا ہے ؟

حضرت علامہ اقبال کا یہ ایمان تھا کہ قرآن کے بغیر مسلمان، مسلمان بن نہیں سکتا :

گر تو می خواھی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

ان کا پیغام مختصراً الفاظ میں یہی ہے کہ قرآن کی روشنی میں سچے مسلمان بن جاؤ اور فطرت نے میری طرح تمہیں جو آب و تاب بخشی ہے، کہ گمراہوں کو راستہ دکھاتا ہوں، جیسے ابر تیرہ و تار کے اندر سے چمکتی بجلی بھٹکے ہوئے لوگوں کو راستہ دکھاتی ہے، تم بھی ایسے ہی بن جاؤ :

بہ آں آب و تابے کہ فطرت بہ بخشد
درخشم چو ابرے بہ ابر سیاھے

۔ کہا جاتا ہے کہ علامہ اقبال ایک مستقل نظام فکر رکھنے والے اسلامی مثالی معاشرہ کی تشکیل کے خواہاں تھے، آپ کے خیال میں ان کے ذہن میں کس قسم کے مثالی معاشرہ کا نقشہ تھا۔ ؟

بے شک وہ ایک مستقل نظام فکر رکھنے والے معاشرہ کی تشکیل چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک صحیح اسلامی مثالی معاشرہ وہی تھا، جو حضور سرور کائنات کے عہد مقدس میں ظہور پذیر ہوا، اس معاشرہ میں فرقہ

بندی کی قطعاً کوئی گنجائش نہ تھی کیونکہ فرقہ بندی کو قرآن نے کفر قرار دیا ہے، اور حضرت علامہ اس کفر کے شدید مخالف تھے۔ وہ دین کی عظمت و رفعت کے قائل تھے اور اوہام پرستی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ہمارے علماء کرام تنگ نظری تعصب اور فرسودہ توہمات کا شکار ہونے کی بجائے وسیع النظری، کشادہ ظرفی اور اعلیٰ اقدار کو حرزجان تصور کریں اور صحیح اسلامی خطوط کے تحت ایک مستقل نظام کی اساس پر مثالی اسلامی معاشرہ تشکیل کریں، جس میں ایک دوسرے کو کافر کہنے والا کوئی نہ ہو۔ مجھے ان کا وہ بیان آج بھی یاد ہے جو ۵۰ برس قبل اخبار میں شائع ہوا تھا۔ اس میں حضرت علامہ نے فرمایا تھا۔

''تمارے دین کی یہ عظیم الشان بلند نظری، ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں۔ جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی، بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے، جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں، ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ کو محسوس کرنے لگے۔(۱)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کو علماء کرام سے بڑی توقعات وابستہ تھیں، کہ وہ نئی نسل کی احسن تربیت میں اپنا بھر پور کردار ادا کر سکیں گے۔ مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ اور حضرت علامہ

---

۱ - 'روزنامہ انقلاب' ۲۳ مارچ ۱۹۳۲ء

جس قسم کا مثالی معاشرہ چاہتے تھے وہ تشکیل نہ پاسکا، اس کی اہم وجہ یہ تھی کہ ہماری سوچ کا مرکز و محور یہی بحث رہی کہ مسلمانوں میں کون مسلمان ہے اور کون کافر؟

اقتصادی اور سیاسی بحرانوں سے تو ملت اسلامیہ کئی بار دوچار ہوئی اور آج بھی تیسری دنیا کے سامنے یہی مسئلہ سر فہرست ہے، مگر یہ جو آپ کے بقول حضرت علامہ نے مذہبی بحران کا ذکر کیا، اس سے ان کی مراد کیا تھی۔؟

عزیزم میں دسمبر ۱۸۹۰ میں پیدا ہوا، اس لحاظ سے میری عمر ۸۲ سال ہو چکی ہے، لیکن میری ساری زندگی ان ہی لفتوں میں گزری ہے، جنہیں بعض لوگ کفر کے فتوے کہتے ہیں۔ یہ فتوے کئی بار حضرت علامہ کی زندگی میں بھی مجھ پر لگائے گئے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ میرے پایہ استقلال میں رائی بھر لغزش نہ آئی، میں ثابت قدم رہا، کیونکہ میں فتوی لگانے والوں پر ایمان نہیں لایا تھا، میں قرآن پر ایمان لایا ہوں اور جو قرآن پر ایمان لایا ہو، اس پر کوئی بھی فتوی اثر نہیں کرتا۔ میں زمانہ شناس تھا۔ اس لئے کئی بار مذہبی بحران سے گزرا۔ میں جب اس موضوع پر گفتگو کرتا ہوں، تو میری نگاہوں کے سامنے وہ حالات متحرک تصویروں کی صورت میں آنے لگتے ہیں جب ذرا ذرا سی بات پر ''اسلام خطرے میں ہے،، کا شور سنائی دینے لگتا ہے۔ ایک بار بمبئی کی ایک مسجد میں بجلی کا پنکھا لگا دیا گیا، تو بعض مولویوں نے مسلمانوں کو وہاں نماز پڑھنے سے روک دیا کہ پنکھا شرک ہے اور اس کی آواز اور ہوا نماز میں مخل ہوگی، لہذا کفر ہے، اس لئے اس مسجد میں نماز نہ پڑھی جائے، اس پر حضرت علامہ، مولانا ظفر علی خان کے ساتھ میرے ہاں تشریف لائے اور استمداد کے طالب ہوئے،

میں نے انھیں ایک تفصیلی جواب لکھ کر دیا کہ اسلام ہرگز خطرے میں نہیں اور پنکھے کی ہوا تو اللہ کی ایک نعمت ہے، جو خشوع و خضوع سے نماز ادا کرنے والوں کے پسینے کی بدبو کو بھی جنت کی عطر بیز ہواؤں میں شامل کردے گی۔ یہ مضمون 'زمیندار' اخبار میں شائع ہوا، تو مولویوں نے مجھ پر کفرکا فتوی لگا دیا اور میں خاموش رہا۔

س :۔ مولانا، کیا دنیا کی عظیم بادشاہی مسجد، لاہور میں خطابت کے عہدے پر فائز ہونے کا بھی کوئی پس منظر ہے ۔؟

ج :۔ جی ہاں ! ایک وقت وہ بھی آیا، جب اللہ اکبر کی صدا کو دور دور تک پہنچانے کے لئے مساجد میں لاؤڈسپیکر لگائے گئے تو بعض جید علماء کرام نے اس اقدام کو بھی کفر قرار دیا اور چند ایک نے تو لاؤڈسپیکر کی موجودگی میں مسجدوں میں نماز جمعہ پڑھانے سے انکار کر دیا۔ میں نے اس موقع پر بھی ان ملاؤں کی ہاں میں ہاں ملانے سے انکار کیا، تو مجھ پر ایک اور کفر کا فتوی لگا دیا گیا۔ اس دوران میں ''قبروں کا فتنہ،، برپا ہوچکا تھا، جس کے نتیجہ میں انجمن خدام الحرمین، بنائی گئی۔ اس کے کرتا دھرتا علی برادران تھے، انھوں نے ایک جلسہ منعقد کرنا چاہا کہ حج کا بائیکاٹ کیا جائے۔ انجمن ھذا کا موقف یہ تھا کہ چونکہ سعودی حکومت نے اپنے ملک سے قبروں کے نام و نشان مٹا دئے ہیں، لہذا احتجاج کے طور پر حج کا بائیکاٹ کیا جائے، یہ تھی قبوں کے فتنہ کی تحریک — — جس کا غوغا سن کر مولانا ظفر علی خان میرے پاس چل کر آئے، اغلباً یہ ۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے۔ مولانا نے انہدام القبور، انہدام القباء وغیرہ عنوانات کی کئی کتابیں اور پمفلٹ مجھے دکھائے اور کہا کہ اس موضوع پر دیوبندی اور وھابی تک نہیں بول رہے،

آپ ہی دو چار سطریں لکھ دیجئے، میں نے ان کے اصرار پر ایک تفصیلی مضمون لکھا جو تین اقساط میں مولانا ظفر علی خان کے اخبار 'زمیندار' میں شائع ہوا۔ اس کی سرخی مولانا غلام رسول مہر نے ''اجتماع جیوش اسلامیہ'' تجویز کی۔ میرے اس مضمون کا لب لباب یہ تھا کہ اے برصغیر کے مسلمانو! سوچو تو ذرا، ان قبوں کے مسمار ہونے کی خبر تمہیں انگریز سرکار نے پہنچائی ہے، جس کو تم اپنا دشمن سمجھتے ہو، تم میں سے کیا کسی نے کوئی قبہ خود اپنی آنکھوں سے گرا ہوا بھی دیکھا ہے۔؟ پھر تم حج کا بائیکاٹ کیوں کر رہے ہو؟ سوال یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کی روشنی میں مسلمہ مشرکوں کے اقتدار میں ان کی شرائط و قیود کے مطابق خانہ کعبہ کا طواف کیا اور عرفات و مزدلفہ میں قیام کیا، تو سعودی فرمانروا کی موجودگی میں تم حج کا بائیکاٹ کیوں کر کروگے۔؟ اور یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ اگر ایک آدمی بالفرض مٹی اور اینٹوں کے قبے گراتا ہے، تو تم خدا کے گھر کے دشمن بن جاؤ۔

اس مضمون کی اشاعت کے بعد علامہ اقبال نے مجھے یاد کیا۔ میں حاضر ہوا۔ گزشتہ تین روز کے اخبارات ان کے سامنے تھے۔ آپ نے میری طرف دیکھا، ھنس کر فرمایا: بدو مولوی! تیری خیر نہیں۔ مزید فرمایا: باتیں تو ساری ٹھیک ھیں، مگر تمہاری شنوائی نہیں ہوگی۔

اور علامہ کا یہ اندیشہ حرف بہ حرف درست ثابت ہوا۔ انجمن خدام الحرمین کے جلسہ عام میں، مجھ پر لعن طعن کی گئی، صدر جلسہ نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ حج کے بائیکاٹ کی قرار داد (Resolution) پاس کرنے سے پہلے جس شخص کا یہ مضمون تین قسطوں میں شائع

ھوا ہے، اور جو حنفیوں کے دارالعلوم میں صدر مدرس ہے، اس کو کافر قرار دو اور جو اس کے کفر میں شک کرے وہ بھی کافر، اور مطالبہ کرو کہ اس شخص کو ملازمت سے برخاست کیا جائے، ورنہ دارالعلوم کے لئے چندہ بند کرنے کی مہم شروع کردی جائے گی۔ ایک پیر صاحب نے اس قرار داد کی تائید کی۔ وہ میرے ضلع کے تھے اور میں جلسہ سے قبل انھیں اپنے ھاں چائے پر دعوت دے چکا تھا۔ رات کو میرے خلاف کفر کی قرار داد پاس ھوئی، اگلے روز میں انھیں اپنے غریب خانے پر لانے کے لئے بازار حکیماں پہنچا جہاں وہ اقامت پذیر تھے، پیر صاحب اور میں دونوں چلے آرھے تھے اور سب لوگ انگشت بدنداں تھے۔ اتفاق سے راستے میں حضرت علامہ مل گئے، انھوں نے آگے بڑھ کر ھم سے سوال کیا کہ آپ دونوں میں سے مسلمان کون ہے۔؟ پیر صاحب خاموش رہے، میں نے بر جستہ کہا: پہلے یہ اور پھر میں۔ اور علامہ مسکرا کر بازار حکیماں کی طرف چل دئے۔

چائے کی دعوت میں پیر صاحب نے اس موضوع کو پھر زیر بحث میں لانا چاھا، مگر میں نے انھیں روک دیا اور کہا کہ جو کچھ ھوا، اسے بھول جائیے، میری تو ساری زندگی ان ھی ھنگاموں میں گزری ہے اور مجھے ان فتوؤں کی کوئی پرواہ نہیں۔ گویا کیفیت یہ تھی کہ ع:

میں ھوا کافر تو وہ کافر مسلماں ھوگیا

اس روز مجھے دارالعلوم نعمانیہ کی طرف سے ملازمت سے سبکدوشی کا پروانہ مل گیا۔ قبل ازیں میں پہلے ھی استعفی پیش کر چکا تھا، کیونکہ تحریک خلافت میں دارالعلوم کا ایک ایک رکن میرے خلاف ھو چکا تھا جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ھوں، بہر حال میں اپنے اس مکان سے ملحقہ ''اونچی مسجد،، میں آگیا۔ اور پھر حضرت علامہ کی

کوششوں سے مجھے بادشاھی مسجد کی خطابت مل گئی، جہاں میں نے لاؤڈسپیکر کے ساتھ پہلا جمعہ پڑھایا۔ تو صف اول کے نمازیوں میں حضرت علامہ بھی شریک تھے۔ میں نے اس روز اجتہاد کے موضوع پر تقریر کی۔

س :۔ مولانا ! کیا حضرت علامہ بھی اجتہاد کے قائل تھے ۔ ؟

ج :۔ وہ تو خود سراپا اجتہاد تھے ۔

س :۔ ان کا نظریہ اجتہاد کیا تھا ۔ ؟

ج :۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ اجتہاد بڑا واضح تھا، وہ احکامات جن کی قرآن حکیم نے کوئی تاویل یا کیفیت متعین نہیں کی، حضرت علامہ کا ان کے بارے میں نظریہ تھا کہ انھیں وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالا جائے۔ حضرت علامہ کا یہ ایمان تھا کہ قرآن ایک ایسی کتاب ھے، جو قیامت تک رھنمائی کے لئے نازل کی گئی ھے اور اس کی ھدایتیں ھم سب کے لئے نجات اخروی کا باعث ھوں گی۔ نیز قرآن نے بعض احکامات کی کیفیت بیان نہیں کی مثلاً جرم و سزا وغیرہ کی نوعیت، کیونکہ جیسے جیسے جرائم کی رفتار اور اس کی صورتیں بدلتی رھیں گی، ویسے ھی اس کی سزاؤں میں بھی تبدیلی لازماً ھوگی، لہذا وہ لوگ جو قرآن کی ھدایات کو سمجھتے ھیں، حضرت علامہ ان سے بڑی توقعات رکھتے تھے کہ وہ اجتہاد کے ذریعہ قرآنی تعلیمات کو وقت کے تقاضوں کے مطابق پیش کریں۔

س :۔ اقبال نے جس جہان نو کا خواب دیکھا تھا، کیا ھم اس کے مطابق صحیح رخ پر آگے بڑھے ھیں ؟ اگر نہیں بڑھے تو کیوں ؟ اس خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لئے ھمیں کیا کرنا چاھئے ؟

ج :- میرے خیال میں حضرت علامہ کے جہان نو کا خواب ابھی تک شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکا اور ہم وہیں کھڑے ہیں جہاں پہلے تھے، بلکہ ایک لحاظ سے پیش رفت کی بجائے ''ترقی معکوس،، ہوئی ہے - کیونکہ ہم میں بہت سی اخلاقی برائیاں راہ پاگئی ہیں - ہم نے اپنا چلن چھوڑ دیا ہے اور غیر قوموں کے شعار کو اپنا کر اپنا ملی تشخص گنوا بیٹھے ہیں - نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے ملک میں ہی نہیں، بلکہ پوری دنیا میں انتشار و افتراق کا شکار ہو چکے ہیں - انگریز کی جس چالاکی کو علامہ اقبال رح اور سنوسی رح ایسے رہنماؤں نے بھانپ لیا تھا، وہ آج ساری دنیا کے سامنے ہے - چوبیس لاکھ یہودی، بارہ کروڑ عرب مسلمانوں کو تگنی کا ناچ نچا رہے ہیں - وہاں نہ دولت کام آتی ہے نہ تیل - فی زمانہ نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر مسلمانوں کے اتحاد کی ضرورت ہے - وہ اتحاد جس کے پس پردہ حضرت علامہ، مسلمانوں کے لئے جہان نو کا خواب دیکھ رہے تھے، آج اس خواب کو حقیقت میں بدلنے کی اشد ضرورت ہے -

ڈاکٹر سید عبداللہ

س - سید صاحب ! آپ ایسے بزرگ اور قابل احترام استاد کو حضرت علامہ اقبال سے ارادت مندی کا شرف حاصل ہے - کیا آپ گزرے ہوئے ایام کی یاد تازہ کرنا پسند کریں گے ؟

ج - عزیزم، میں حضرت علامہ اقبال کا وہ ارادت مند ہوں جس کی حیثیت اس شخص کی سی ہے جو مرد کامل کے کمال یا جمال کے محض تصور یا اس کی دید ہی سے حیرت زدہ ہوجاتا ہے - میں ۱۹۲۶ء سے تا ایام وفات حضرت علامہ اقبال کے آستانے پر حاضر ہوتا رہا، مگر پچھلی صفوں

کے خاموش تماشائی کی طرح، اپنی حد سے آگے نہیں بڑھا ۔ ان سے ملاقات اور گفتگو کے موقعے بھی ملے، مگر ان گفتگوؤں کو کبھی چھپوایا نہیں ۔ کیونکہ مجھے اپنی کم علمی کا پورا احساس رہا، مبادا میں علامہ کے ملفوظات کو نقل کرنے میں ٹھوکر کھاجاؤں ۔

س ۔ حضرت علامہ سے آپ کی براہ‌راست ملاقاتیں بھی تو ہوئی ہوں گی؟

ج ۔ جی ہاں، اس موضوع پر میں پہلے بھی اظہار خیال کر چکا ہوں اور آج پھر عرض کروں گا کہ براہ‌راست ملاقاتیں بہت ہوئیں جن کے مدھم تاثرات میرے ذہن میں محفوظ ہیں ۔ مگر دو تین غیر معمولی موقعے ایسے بھی ملے جن کی یاد آج تک محو نہ ہوئی' ویسے مجھے امید ہے کہ ان کا تذکرہ فائدے سے خالی نہ ہوگا ۔

میں پہلی مرتبہ ۱۹۲۶ء میں علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا اور براہ‌راست ان سے بات چیت کرنے کا موقعہ ملا ۔ میں اس زمانے میں، پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں قلمی کتابوں کی تفصیلی فہرست بنانے پر مامور تھا اور میرے کام کے نگران پروفیسر محمد شفیع، پروفیسر محمد اقبال اور حافظ محمود خان شیرانی تھے ۔ پروفیسر محمد شفیع نے مجھے حکم دیا کہ میں فخری بن امیری کا ''انتخاب شعرائے فارسی،، لے کر حضرت علامہ کی خدمت میں حاضری دوں اور انھیں وہ کتاب دکھاآؤں ۔ اس کتاب کا نام ''تحفۃ الحبیب،، ہے ۔ اس میں مصنف نے فارسی شاعروں کی غزلیات کو اس طریق سے جمع کیا ہے کہ مختلف شعرا کی ہم طرح غزلیں یکجا ہوگئی ہیں ۔

حضرت علامہ نے مجھ سے کتاب لی اور ورق گردانی شروع کردی ۔ ساتھ ساتھ پینسل سے اشعار پر نشان لگاتے گئے ۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ انتخاب

اشعار پروفیسر شفیع صاحب کی فرمائش پر کیا جا رہا ہے۔ شاید شفیع صاحب اس زمانے میں فارسی نصاب(۱) مرتب کر رہے تھے اور چاہتے تھے کہ اس انتخاب میں حضرت علامہ کے ذوق کی رہنمائی سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس انتخاب میں ایک گھنٹے سے زیادہ وقت انہوں نے صرف کیا ہوگا۔ جب فارغ ہوئے تو مجھ سے دریافت کیا۔ ''بھائی! فارسی کے طالب علم ہو یا عربی کے،، ؟

میں نے عرض کیا: ایم۔اے فارسی میں کیا ہے مگر عربی مسجدوں میں پڑھی ہے۔

فرمایا: عربی والا جب فارسی میں آتا ہے تو فارسی اس کے لئے مشکل نہیں رہتی۔

وہ فرماتے گئے میں خاموشی سے سنتا رہا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں ان کی باتوں کا کیا جواب دوں۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھ سے فرمایا: یہ کاغذ لو، اور اس پر خواجہ حافظ اور جامی کی وہ غزلیات لکھ دو جن کے مطلع یہ ہیں۔

شاہ شمشاد قدان خسرو شیریں دھناں

کہ بمژگاں شکند قلب ہمہ صف شکناں (حافظ)

اے ہمہ سیم بران سنگ تو بر سینہ زناں

تلخ کام از لب بے گون تو شیریں دھناں (جامی)

اس اثنا میں وہ گنگناتے رہے۔ جب میں لکھ چکا تو فرمایا۔ ''تم فارسی کے فارغ التحصیل ہو، بتا سکتے ہو ان میں سے کون سی غزل اچھی ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا جواب دوں۔ بہر حال میں نے

(۱) یہ مجموعہ بعد ازاں ''سبد گل،، اور ''گلشن معانی،، کے نام سے شائع ہوا۔

عرض کیا کہ حافظ کی غزل اچھی ہوگی۔

فرمایا ''یہ حافظ کی جادو گری کا اثر ہے - ورنہ شیراز اور خراسان کا فرق تو واضح ہے - شیرازی میٹھی باتوں سے دلوں کو لبھارہا ہے اور ہرات والا کوہستانی لہجے میں بات کہہ رہا ہے اور ہم لوگوں کو کوہستانی لہجے کی اب زیادہ ضرورت ہے -

اس کے بعد جامی کی غزل تحت اللفظ پڑھی - ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی رگ رگ میں شعر اثر کر رہا ہے - اس کے بعد مجھے رخصت ہونے کی اجازت دی اور فرمایا کہ ''پروفیسر شفیع سے کہنا مجھ سے ذرا مل لیں،، -

علامہ اقبال کی خدمت میں حاضری کا دوسرا موقعہ مجھے ۱۹۳۰ء میں ملا - لاہور میں ہم لوگوں نے ایک مجلس اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے قائم کر رکھی تھی - خواجہ عبدالوحید صاحب (۲) اس کے سیکریٹری تھے - ہم نے ارادہ کیا کہ علامہ اقبال کی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے یوم اقبال منایا جائے - یہ برصغیر ہند و پاکستان میں پہلا ''یوم اقبال،، تھا - ہم اس سلسلہ میں علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ وہ ایک شام ہوٹل سٹفلز(۳) (Stiffle's) میں عقیدت مندوں کے ساتھ چائے پئیں - علامہ نے یہ دعوت قبول فرمائی -

گفتگو سے قطع نظر - سٹفلز میں ان کی آمد، ان کا حلیہ - مشہدی لنگی وغیرہ تمام جاذب نظر تھیں - ان کی شخصیت میں تمکنت اور وقار تھا - یہ مجلس بھی بااثر اور ایک یادگار موقعہ تھا اس مجلس میں علامہ اقبال نے تقریر بھی فرمائی - اس کا خلاصہ جو مجھے یاد ہے حسب ذیل ہے :-

---

(۲) مصنف ''کتابیات اقبال،،

(۳) یہ ہوٹل شاہراہ قائد اعظم (مال روڈ) پر واقع تھا اور اب ختم ہو چکا ہے -

''میں شاعر نہیں ہوں، شعر شناس ہوں اور حکمت زندگی اور حکمت دین کا طالب علم ہوں۔ میری آرزو ہے کہ میں اپنے ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں پر دین کے اسرار منکشف کر جاؤں تاکہ وہ دین کے قریب آجائیں،،۔

ملاقات کا تیسرا موقعہ مجھے اس زمانے میں ملا جب علامہ اقبال مدراس لیکچرز کی تیاریاں کر رہے تھے مجھے پیغام بھیجا کہ لائبریری میں فلسفہ کی عربی و فارسی کی جو کتابیں ہیں ان کی فہرست بنا کر حاضر کروں۔ جب میں حاضر ہوا تو فرمایا : ''مسلمانوں میں دین والا آدمی جب فلسفے کی اصطلاحوں میں بات کرتا ہے تو اس کی بات میں وقار اور وزن پیدا ہوجاتا ہے مگر محض فلسفے والا آدمی جب دین کی بات کرتا ہے تو اس کی نہ فلسفیانہ حیثیت ہوتی ہے نہ دینی لحاظ سے اس میں وزن،،

س۔ سید صاحب ! کیا اقبال کی شاعری میں ابدیت کے عناصر ہیں یا نہیں ؟

ج۔ اقبال نے بہت سے موقعوں پر خود کو شاعر فردا قرار دیا ہے یا بالفاظ دیگر ''حکیم آیندہ،، . . . کیونکہ اقبال خود کو شاعر یا غزل خواں نہیں کہتے تھے۔ بلکہ اپنے اس لقب کو باعث عار سمجھتے تھے . . . تاہم اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ وہ شاعر بھی تھے اور ایک ایسی ادبی روایت یا ادبی فکر کے مؤسس تھے جس سے ہمارا ادب و شعر ایک نئے شعور سے آشنا ہوا۔ اور اس سے وہ پھل پھول پیدا ہوئے جن کی تازگی شگفتگی، رس جس اور قوت و توانائی سے ادب و شعر کی دنیا اب تک ایک نئی زندگی محسوس کررہی ہے اور آیندہ بھی کرتی رہے گی۔

اقبال نے ''جاوید نامہ،، میں شاعری اور ادب کی اس اہمیت پر خود بھی زور دیا ہے اور لکھا ہے۔ ع

ملت بے شاعرے انبار گل

شاعر کے بغیر کوئی قوم صحیح معنوں میں قوم ھی نہیں ھوتی، تودۂ گل بنی رھتی ھے ۔" تو اس سے صاف ظاھر ھے کہ اقبال کو شاعر کہہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں، مگر ایسے شاعر جو حکیم بھی تھے ۔ درحقیقت وہ ایسے شاعر تھے جن کی شاعری نے ملت کے جسم میں، جو ایک معنی میں راکھ کا ڈھیر بن چکی تھی، زندگی کی روح پھونکی اور ''انبار گل،، کو ایک زندہ اور باشعور قوم میں بدل دیا۔

یہ سب کچھ اس بات کا ثبوت ھے کہ اقبال شاعر تھے اور شاعر ملی بھی ۔ مگر کیا وہ شاعر فردا بھی ھیں ؟ اس کا جواب اس وضاحت پر منحصر ھے کہ یہاں شاعر فردا سے مراد کیا ھے ؟ شاعر فردا وہ شاعر ھے جس کی شاعری اپنے مستقبل اور پائیداری معانی و افکار کی بدولت آج کی طرح کل بھی . . . یعنی صدیوں تک . . . زندہ و پائندہ رھنے والی ھو، جس کے نغموں سے کل کے لوگ بھی آج کی طرح محظوظ ھوں اور جس کے پیغام سے آنے والی نسلیں . . . یعنی آئندہ کے انسان اسی طرح تسکین و قوت کا سامان حاصل کریں ۔ جس طرح آج کے انسان تسکین و قوت کا سامان حاصل کر رھے ھیں ۔ یہ صفات کلام اقبال میں موجود ھیں ۔

س ۔ سید صاحب، آپ کے خیال میں، اقبال کے ھاں، اچھے انسان کا تصور کیا ھے ؟

ج ۔ اقبال نے اپنے پسندیدہ انسانوں کے حقیقی اور زندہ نمونے ھمارے سامنے رکھے ھیں ۔ مثلاً آنحضرتؐ کے علاوہ صحابہ کرامؓ، حضرت صدیق اکبرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، شیر حق (اسرار ص ۳۰) حضرت ابوذرؓ، حضرت بلالؓ وغیرہ اور ان کے علاوہ بعض سلاطین، بعض اولیائے کرامؒ اور بعض دوسرے رجال و زعماء

جن کے اوصاف میں کبھی عام طور سے کبھی خاص طور سے اقبال کے پسندیدہ انسان کے اوصاف پائے جاتے ھیں۔

اقبال کے ھاں بعض شخصیتیں ایسی بھی ھیں جن کی مثالیت کامل نہیں بلکہ کسی ایک وصف خاص میں وہ نمایاں ھیں، اور یہ سیاق و سباق سے ظاھر ھو جاتا ھے کہ وھاں اقبال کی پسند کی وجہ کیا ھے ؟

اقبال کے ھاں اچھے اور بلند انسان کی جھلک ان کی کتابوں میں بکھری ھوئی صورت میں جابجا ملتی ھے لیکن یک جا مربوط تصویریں بھی موجود ھیں۔ مثلاً اسرار خودی میں، خودی کی تربیت کے ضمن میں۔ عشق و محبت کی اھمیت کے بعد اطاعت، ضبط نفس اور نیابت الٰہی کے ذمے داریوں کی صلاحیت .مثلاً ذکر و فکر اور فقر غیور وغیرہ کا ذکر کر کے ان دوسرے خصائل کا بھی ذکر کیا ھے جو اقبال کے ''اعلی انسان،، کے لئے ضروری ھیں۔ پھر ان عیوب کا بھی ذکر کیا ھے جو پسندیدہ انسان کو اپنے مقام سے گرا دیتے ھیں۔ مثلاً حرص، خوف، غم اور وسواس، اس کے علاوہ وہ احتیاج جو انسان کو سوال پر مجبور کر دے۔

س۔ اقبال کا آنے والی شاعری پر کیا اثر ھوا ؟

ج۔ قابل غور مسئلہ یہ ھے کہ اقبال کے فوراً بعد فکر اقبال کے خلاف دانستہ یا نادانستہ مخالفانہ تحریکیں کیوں اٹھیں اور یہ بھی دیکھنا ھے کہ ان کی نوعیت کیا تھی ؟

میری چھان بین کا خلاصہ یہ ھے کہ سب سے نمایاں رد عمل میراجی کی صورت میں ھوا۔ میراجی کی تحریک اکثر صورتوں میں اقبال کے خیالات کی ضد تھی، اس کے علاوہ مجھے یہ بھی عرض کرنا ھے کہ میراجی کی شاعری لفظی موسیقی اور رمز کی شاعری تھی اور اس حد

تک مجھے اس کے خلاف کوئی اعتراض نہیں۔ اعتراض اس فکر پر ہے جو میراجی کی شاعری میں موجود ہے۔ میں اقبال کے ساتھ میراجی کو اس لئے معرض بحث میں لارہا ہوں کہ اقبال کے افکار کے ساتھ ساتھ ان ''خودی شکن،، افکار کا تصور بھی سامنے آجائے جن کے خلاف حضرت علامہ نے عمر بھر جہاد کیا، تعجب کی بات یہ ہے کہ شاعر مشرق نے جس ارضیت اور زمین پرستی کے خلاف شدید احتجاج کیا وہی پاکستانی قوم کے ادب پسند حصے کے ایک موثر فرقے کا مذہب ہے۔ اس کے لئے طرح طرح کے الفاظ اور اصطلاحیں تراشی گئی ہیں مثلاً اس ملک کا اصلی کلچر، اس ملک کی بو باس، اس ملک کا زمینی کلچر، وغیرہ وغیرہ۔ پھر ادب کے نام سے ہندو دیومالا اور زمین کی پرستش کا سبق دیا جارہا ہے۔ اس مذہب کی ابتدا میراجی سے ہوئی۔ اس لئے میراجی کا میں خاص ذکر کر رہا ہوں۔ میراجی کے اثرات اب بھی گہرے ہیں۔

س۔ اقبال کا ایک اچھی سوسائٹی کا تصور کیا ہے ؟۔

ج۔ اقبال کی نظر میں ہر چند کہ فرد و اجتماع دونوں ضروری ہیں اور اجتماع کی فائق حیثیت مسلم ہے مگر ان کے نزدیک فرد اجتماع کا وہ سنگ بنیاد ہے جس کی صحیح تربیت سے اچھا اجتماع اور اچھا معاشرہ وجود میں آسکتا ہے اس لئے اقبال نے بعض دوسرے سوشل فلسفوں کے برعکس فرد کو محض پرزہ اور اجتماع کا بے شعور کارندہ قرار نہیں دیا بلکہ ان کی نظر میں یہ ایک ایسا خود آگاہ جز ہے جو اگرچہ خود کے شعور سے بھرپور ہے مگر یہی معرفت اسے یہ بھی سکھاتی ہے کہ اجتماع کے لئے قربانی ہی میں خود کی بقا ہے۔ اور یہ حقیقت اقبال کی کتاب ''رموز بے خودی،، میں بیان ہوئی ہے۔

س۔ ڈاکٹر صاحب، اقبالیات کے سلسلہ میں جو کام ہو رہا ہے ، کیا آپ اس سے مطمئن ہیں ؟

ج۔ آج تک اقبال پر اور ان کے کلام کے مختلف موضوعات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر اقبالیات کا موضوع ابھی تک تشنہ ہے۔ درحقیقت ابھی تک مطالعہ اقبال کی تحریک صحیح معنوں میں شروع ہی نہیں ہوئی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اقبال شناسی اور اقبال فہمی کے لئے کئی علوم کی ضرورت ہے۔ مشرق و مغرب کے عام علوم، اسلامی علوم کے امتزاج کے ساتھ سیکھے جائیں۔ محض جدید تعلیم صحیح اقبال شناسی پیدا کرہی نہیں سکتی۔ میری رائے میں قابل توجہ امور جن پر اقبالیات کے بارے میں کام کرنا باقی ہے یہ ہیں :

۱۔ اقبال کے مآخذ کا مسئلہ۔

۲۔ اقبال کے اہم موضوعات کی وضاحت کا مسئلہ۔

۳۔ اقبال کے علمِ کلام کی تدوین کا مسئلہ۔

۴۔ پاکستان کے نصب‌العین میں فکر اقبال سے استفادہ، کس طرح کیا جائے۔

۵۔ فکر اقبال کے دبستان کا قیام۔ اسلامی طرز تفکر۔ اسلامی قانون۔ ہمیں اسلامی طرز حیات اور اسلامی مملکت کے رجحانات کو فروغ دینا چاہئے اور یہ آخری معاملہ قوم کی توجہ چاہتا ہے، اور اقبال پر کام کرنے والی مجالس کا فرض یہ ہے کہ لوگوں میں صحیح تحقیقی سپرٹ پیدا کریں۔ محض جذباتی انداز کی اقبال پرستی کافی نہیں۔ بلکہ علمی بنیادوں پر کام کرنے کی اشد ضرورت ہے اور توفیق میرے رب کے ہاتھ میں ہے۔

محمد عبداللہ قریشی

س۔ ازراہ کرم بتائیے کہ آپ اقبال سے کب اور کہاں ملے؟

ج۔ علامہ اقبال کی نظمیں تو میں بچپن ہی سے پڑھ رہا تھا اور ان کے نام سے بخوبی واقف تھا۔ میرے ایک بزرگ شکوہ اور جواب شکوہ مجھ سے اکثر پڑھوا کر سنتے تھے یہاں تک کہ مجھے از برھوگئی تھیں۔ میں نے حضرت علامہ کو دور دور سے دیکھا بھی تھا۔ پھر چند نظمیں بالخصوص ''خضر راہ،، اور ''طلوع اسلام،، ان کی زبانی خاص لے میں بہت قریب سے سنیں، جن کا کیف و سرور آج تک محسوس کر رہا ہوں، مگر میری پہلی ملاقات ان سے اس زمانے میں ہوئی جب وہ ۱۹۲۶ء کے انتخابات میں لاہور کے شہری حلقے کی طرف سے پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن کی حیثیت سے امیدوار کھڑے ہوئے۔ شہر کے دوسرے علم دوست نوجوانوں کی طرح میں بھی حضرت علامہ کے زبردست حامیوں میں تھا اور ان کی انتخابی مہم کو کامیاب بنانے کے لئے رضاکارانہ کام کر رہا تھا۔

ایک روز ملک لال دین قیصر، پروفیسر محمد دین تاثیر مولوی محمد بخش مسلم اور شیخ غلام مصطفیٰ حیرت کے ہمراہ میں حضرت علامہ کی خدمت میں میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں حاضر ہوا۔ الیکشن کے کرتا دھرتا میرے یہی دوست تھے جو علامہ کے خاص عقیدت مند تھے۔ علیک سلیک کے بعد پچھلی کارگزاری اور آئندہ لائحہ عمل کے متعلق باتیں شروع ہوئیں۔ رازداری کے خیال سے یا ویسے ہی علامہ نے ایک دفعہ میری جانب یوں دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں۔ ''یہ اجنبی کون ہے؟،، ڈاکٹر تاثیر مرحوم نے میرا تعارف کرایا اور کہا۔ ''یہ

نہایت مخلص اور خاموش ورکر ہیں !،، حضرت علامہ نے ایک بار پھر میری طرف غور سے دیکھا اور فرمایا :

''ہاں ! کام کرنے والے خاموش ہی ہوتے ہیں ۔،،

کچھ دیر ضروری باتیں ہوئیں اور ہم اجازت لے کر واپس چلے آئے اور اس وقت تک سرگرم کار رہے جب تک حضرت علامہ تین ہزار سے زائد ووٹوں کی اکثریت سے اپنے حریف کو شکست دے کر کامیاب نہیں ہوگئے ۔

اس پہلی ملاقات کے بعد کئی جلسوں اور تقریبوں میں حضرت علامہ سے ملنے کا اتفاق ہوا ۔ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے جلسوں میں بھی پروفیسر محمد علم‌الدین سالک کے ہمراہ میں برابر شریک ہوتا رہا، اس وقت جب اس کے صدر میرزا بشیر الدین محمود تھے اور اس وقت بھی جب اس کے صدر علامہ اقبال تھے ۔ مگر حضرت علامہ کے سامنے لب کشائی کی جرأت کبھی نہیں ہوئی ۔ ہمیشہ توجہ سے ان کی حکیمانہ باتیں سنتا اور چپ چاپ اپنا کام کرتا رہا ۔ میں جب بھی ان کی صحبت سے اٹھ کر آتا تھا تو ان کے تبحر علمی کا گہرا نقش لے کر اور محبت رسولؐ کے جذبے سے سر شار ہوکر آتا تھا ۔

س ۔ آپ کے خیال میں علامہ اقبال کے نظام فکر کا مرکزی نقطہ کیا ہے ؟ وہ کس بنیادوں پر معاشرہ کی تشکیل چاہتے تھے ؟

ج ۔ اقبال کے اس نظام فکر اور حکیمانہ تعلیمات کا سر چشمہ صرف ایک تصور ہے جسے انھوں نے ''خودی،، کا نام دیا ہے ۔ ان کے باقی تصورات اسی ایک تصور کے گرد گھومتے اور اسی کے حاصلات و مضمرات ہیں اور اسی سے علمی اور عقلی طور پر وابستہ ہیں ۔ اس تصور کو خودی کا نام دینے کے لئے بھی اقبال کو سخت کشمکش سے دوچار ہونا پڑا ۔

انھوں نے خودی کے لفظ کو جو غرور اور تکبر کے برے معنوں میں استعمال ہوتا تھا، خود اعتمادی، خود داری، عزت نفس اور حفاظت نفس کے نئے معنے پہنائے اور سب کو چونکا دیا۔ انھوں نے دعوت دی کہ اس عالم کی حقیقی نجات یا معاشرت کے تمام شعبہ جات کی کامیابی و کامرانی اسلامی اصولوں کی پابندی اور ان کے نفاذ سے وابستہ ہے۔ وہ ارکان اسلامی کی صداقت اور ہمہ گیری پر زور دیتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ خود مسلمان ہیں بلکہ محض اس بنا پر کہ انسانی ذہن فکر اسلام سے انحراف کر ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اپنے اشعار میں الفاظ اور ترکیبیں تو ضرور شاعرانہ رکھتے ہیں لیکن بحث اور استدلال ایک فاضل اور حکیم کے انداز سے کرتے ہیں۔

س۔ اقبال نے جس جہان نو کا خواب دیکھا تھا کیا وہ حقیقت میں تبدیل ہوا ؟

ج۔ ایک دفعہ انھوں نے فرمایا کہ انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔ جب تک دنیا کی تعلیمی طاقتیں اپنی توجہ احترام انسانیت کے درس پر مرتکز نہ کردیں گی، یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی بنی رہے گی۔ وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے، جو نسل ،زبان، رنگ اور قوم سے بالاتر ہے۔ جب تک نام نہاد جمہوریت، ناپاک قوم پرستی اور ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو پاش پاش نہ کر دیا جائے گا، جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے ''الخلق عیال اللہ'' کا قائل نہ ہوجائے گا، انسان اس دنیا میں فوز و فلاح اور کامرانی کی زندگی بسر نہ کر سکے گا اور اخوت، حریت اور مساوات کے الفاظ کبھی شرمندۂ معنی نہ ہوں گے۔ میرے نزدیک ان کے 'جہان نو' کا خواب اور ان کا پیغام یہی ہے۔ اب رہی یہ بات کہ ہم اقبال کے جہان نو کی سمت میں آگے بڑھے ہیں یا نہیں، تو اس کا فیصلہ ہم خود کر سکتے ہیں۔ ہر

انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنا مواخذہ و احتساب خود کرے، میں اگر اس موضوع کی طرف آگیا تو شکوہ و شکایت کا دفتر کھل جائے گا۔ بہتر ہے کہ ہم اپنے ماضی کی کج ادائیوں کو بھول کر اپنے بہتر مستقبل کی طرف تمام تر توجہ مرکوز کریں۔

س۔ قریشی صاحب ! آپ کا خاص موضوع کشمیر ہے۔ اقبال کا تعلق بھی کشمیر سے بہت زیادہ تھا، آپ اس بارے میں بھی کچھ فرمائیں گے ؟

ج۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اقبال علیہ الرحمۃ کشمیری الاصل تھے او ان کے آباءواجداد کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب آئے اور سیالکوٹ میں آباد ہوئے۔ چنانچہ وہ خود بھی لکھتے ہیں۔

کشمیر کا چمن جو مجھے دلپذیر ہے
اس باغ جانفزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثے میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائیداد
جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

یہ بھی آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ان کے بزرگ کشمیری پنڈتوں کی ''سپرو گوت،، سے تعلق رکھتے تھے جو مسلمان ہوگئے تھے اور ''جن کی ذہانت اور فلسفہ دانی سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا اور غالباً ازروئے قانون توارث اقبال کو اس میں اچھا خاصا حصہ ملاتھا،،۔ ان کے کلا میں بھی جگہ جگہ اس قسم کے اشارے پائے جاتے ھیں :

مرا بنگر کہ در ھندوستان دیگر نمی بینی
برھمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است
یا
میر و مرزا بہ سیاست دل ودیں باختہ اند
جز برھمن پسرے محرم اسرار کجاست

وہ ابنائے وطن کی محبت کے جذبہ سے سر شار تھے۔ انھوں نے اپنے قا

و عمل سے کشمیر اور اہل کشمیر کی ہمیشہ رہبری کی اور ان کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھا۔

اس کا علم شاید بہت کم لوگوں کو ہوگا کہ فروری ۱۸۹۶ء میں لاہور کی کشمیری برادری کے چند بزرگوں نے ایک ''انجمن کشمیری مسلمانان،، کے نام سے قائم کی جس کے اغراض و مقاصد (۱) اصلاح رسوم شادی و غمی (۲) کشمیری مسلمانوں میں تعلیم، تجارت، صنعت و حرفت او، زراعت کو رواج دینا (۳) قوم میں اتحاد و اتفاق بڑھانا وغیرہ تھے۔ اقبال اس وقت سیالکوٹ سے نئے نئے لاہور آئے تھے اور گورنمنٹ کالج میں بی۔ اے کے ایک ہونہار طالب علم تھے۔ وہ اس انجمن کی کارروائیوں میں سرگرم حصہ لیتے تھے۔ اس انجمن کی تاسیس پر اقبال نے ایک نظم بھی پڑھی جس کے چند شعر یہ ہیں :

کیا تھا گردش ایام نے مجھے محزوں
بدن میں جاں تھی کہ جیسے قفس میں صید زبوں
جو سامنے تھی مری قوم کی بری حالت
امنڈ گیا مری آنکھوں میں خون کا سیحوں
انھیں غموں میں مگر مجھ کو اک صدا آئی
کہ بیت قوم کی اصلاح کے ہوئے موزوں
ہزار شکر کہ ایک انجمن ہوئی قائم
یقیں ہے راہ پہ آئے گا طالع واژوں
ملے گا منزل مقصود کا پتا ہم کو
خدا کا شکر کہ جس نے دئیے یہ راہنموں
خدا نے ہوش دیا متفق ہوئے سارے
سمجھ گئے ہیں تری چال گنبد گردوں

بڑھے یہ بزم ترقی کی دوڑ میں یارب
کبھی نہ ہو قدم تیز آشنائے سکوں
جو دوڑ کے لئے میدان علم میں جائیں
سبھوں سے بڑھ کے رہے ان کے فہم کا گلگوں
دکھائیں فہم وزکاء وھنر یہ اوروں کو
زمانے بھر کے یہ حاصل کریں علو و فنوں

یہ نظم اگرچہ بالکل ابتدائی مشق کے زمانے کی ہے تاھم اس میں ماضی وحال کی جھلکیاں بھی نظر آتی ھیں اور مستقبل کے لئے ایک پیغام بھی موجود ہے ۔

اسی انجمن کے کسی اور جلسے میں اقبال نے چند قطعات پڑھے، جن میں سے دو ایک یہ ھیں :

موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دور
یا نافۂ غزال ہوا ہے ختن سے دور
ھندوستاں میں آئے ھیں کشمیر چھوڑ کر
بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور

سو تدابیر کی اے قوم یہ ہے اک تدبیر
چشم اغیار میں بڑھتی ہے اسی سے توقیر
در مطلب ہے اخوت کے صدف میں پنہاں
مل کے دنیا میں رھو مثل حروف کشمیر

ان قطعات میں اقبال نے اپنے سوزو ساز سے قوم کے سامنے اجتماعی نظام کا ایک نقشہ پیش کیا ہے جس کے رنگ و آھنگ سے ان کا نور بصیرت جگمگا رھا ہے ۔

س۔ اھل کشمیر سے محبت رکھنے کے باوجود اقبال ایک عرصہ تک کشمیر جنت

نظیر کو نہ دیکھ سکے؟ کیا یہ صحیح ہے؟

ج ۔ جی ہاں! اقبال ۱۹۲۱ تک کشمیر نہ دیکھ سکے ۔ اسی سال گرمیوں میں اس کے لئے خود بخود اسباب پیدا ہوگئے ۔ ریاست جموں و کشمیر میں شیخ محمد بخش اور سیٹھ کریم بخش نامور تاجر اور رئیس تھے ۔ زمانے کے انقلاب نے ان پر اپنا اثر ڈالا اور پنجاب نیشنل بینک کی شاخ سرینگر نے حساب کتاب اور لین دین کے معاملے میں ان کی ڈگریاں ''قرقیاں،، کراکے ہزارہا روپے کی جائیداد سینکڑوں میں نیلام کرادی ۔ شیخ محمد بخش مرحوم کے داماد منشی سراج الدین نے جو اس وقت مہتمم بندوبست کے مثل خواں تھے اور بعد میں اپنی قابلیت سے ترقی کرکے خود افسر مال ہوگئے تھے، ڈاکٹر اقبال کی قانونی قابلیت سے فائدہ اٹھانے کے لئے ان کو اس مقدمے میں کشمیر بلایا ۔ ڈاکٹر صاحب جون ۱۹۲۱ء میں پہلی مرتبہ مولوی احمد دین وکیل اور اپنے منشی طاہر الدین مرحوم کے همراہ کشمیر گئے اور قریباً دو هفتے سرینگر میں رہے ۔ هاؤس بوٹ میں ان کا قیام تھا ۔ مقدمہ اے ڈی حکیم سیشن جج کی عدالت میں تھا ۔ مگر چند ابتدائی غلطیوں کی وجہ سے اس مقدمے کا فیصلہ حسب منشاء نہ ہوسکا، جس کا اقبال کو افسوس رہا ۔

اقبال کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سرینگر میں اقبال کو ایک اور مقدمہ بھی ملا، یہ رحمان راہ کا تھا جو سرینگر کا باشندہ تھا اور قتل کے الزام میں ماخوذ تھا ۔ اقبال کی بحث سے اتنا ہوا کہ وہ پھانسی پانے سے بچ گیا ۔

قانونی کاموں سے فارغ ہونے کے بعد کشمیر کی سیر کا لطف بھی اٹھایا گیا ۔ چنانچہ ایک دن اقبال، منشی سراج الدین احمد، میر منشی ریذیڈنسی کشمیر، مولوی احمد دین، سیٹھ کریم بخش، منشی نور الٰہی تحصیل دار،

صاحبزادہ محمد عمر اور چند دیگر علم دوست احباب شکارے (۱) میں بیٹھ کر ڈل کی سیر کو گئے۔ نشاط باغ اور شالامار میں کافی وقت گزار کر شام کو یہ قافلہ ادب واپس آیا۔ دونوں وقت مل رہے تھے کہ شکارا اس انجمن ادب کو لئے ڈل میں پہنچ گیا۔ اس وقت آفتاب غروب ہو رہا تھا، شفق پھوٹی ہوئی تھی اور اس منظر کا عکس ڈل کے شفاف پانی میں شور افشانی کر رہا تھا۔ اس کیف آور منظر نے عجیب کیفیت پیدا کردی تھی، جس نے علامہ ممدوح کے دل پر خاص اثر کیا۔ تھوڑی دیر صحیفہ قدرت کے اس سنہری ورق کا مطالعہ کرنے کے بعد خلاق معانی بحر فکر میں غوطہ زن ہوئے اور دو در شہوار نکال لائے۔ نقاش فطرت کی قدرت دیکھئے! دو شعروں میں سارے منظر کی تصویر کھینچ دی ہے۔

تماشائے ڈل کن کہ ہنگام شام
دھد شعلہ را آشیاں زیر آب
بشوید زتن تا غبار سفر
زند غوطہ در آب ڈل آفتاب

جنت ارضی کے اس مختصر سے سفر میں اقبال نے کشمیر اور کشمیریوں کو جن مصائب میں مبتلا دیکھا، اس کا اظہار آپ نے اپنی کئی نظموں میں مختلف پیرایوں سے کیا۔ پیام مشرق میں اقبال کی تین نظمیں کشمیر، غنی کشمیری اور ساقی نامہ ملتی ہیں جن کے ذریعے سے حسن فطرت اور حقائق نمود حیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

کشمیر کے فارسی لٹریچر کی اقبال کے دل میں بڑی قدر و منزلت تھی۔ ملا طاہر غنی کی شخصیت سے وہ اس درجہ متاثر تھے کہ ان کے استغناء کا ذکر کرنے کے علاوہ ان کے بعض اشعار پر تضمینیں بھی لکھیں۔ کشمیر کے متعلق کتابیں لکھنے والوں کی بھی اقبال ہر طرح حوصلہ افزائی

---

۱ کشمیری زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی 'ھلکی کشتی' کے ھیں۔

فرماتے تھے ۔ چند دوستوں کو خود بھی بعض عنوانات پر قلم اٹھا
پر ابھارتے رہتے تھے ۔

کشمیر میں جس قدر صوفیائے کرام تبلیغ اسلام کی خاطر آئے، ان میں حضر
امیر کبیر سید علی ہمدانی کو سب سے زیادہ شہرت اور کامیابی نصیب ہوئی
اقبال ان کی عظمت، بزرگی اور غیر معمولی شخصیت سے بہت متاثر تھے
انہوں نے جاوید نامہ میں ان کا ذکر بڑے پر خلوص الفاظ میں کیا
اقبال کو ان کی تصانیف دیکھنے کا کس قدر شوق تھا ؟ اس کا اند
آپ کے ایک خط کی مندرجہ ذیل عبارت سے کیا جا سکتا ہے ۔

''ذخیرۃ الملوک دیکھنے کا میں بھی مشتاق ہوں ۔ سنا ۔
کوئی شخص کشمیر میں اس کا ترجمہ اردو میں کر رہا ہے ۔،،

۱۹۳۱ء کی تحریک حریت کشمیر کے دنوں میں اقبال کشمیر کے حالا
کا بڑے غور سے مطالعہ کیا کرتے تھے ۔ فرماتے تھے کہ یہ جو کہ
ہو رہا ہے، توقع کے خلاف نہیں ۔ ممکن ہے کبھی اس سے بھی زیا
انقلاب کشمیر میں آئے ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔ اقبال ہی کی تحریک
سے آل انڈیا کشمیر کمیٹی قائم ہوئی جس نے دستوری اور آئینی ذرا
سے کشمیریوں کو جائز انسانی حقوق دلانے کی کوشش کی ۔ اقبا
ہی کی مساعی سے حکومت کشمیر نے گلانسی کمیشن مقرر کیا ج
نے اپنی رپورٹ میں سفارش کی کہ کشمیریوں کو مکمل مذہبی آزاد
دی جائے، مذہبی عبادت گاہوں سے سرکاری قبضہ ہٹا کر انہیں عو
کے سپرد کیا جائے ۔ تعلیم کی اشاعت عام کی جائے، مسلم اساتذہ
تعداد بھی بڑھائی جائے اور دیگر ملازمتوں میں بھی ہر فرقہ کے لوگو
کو ان کے تناسب آبادی کے لحاظ سے حصہ دیا جائے ۔ اقبال نے بحیثیہ
صدر مسلم کانفرنس کے پلیٹ فارم سے بھی کشمیریوں کے مطالبات
حمایت کی ۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وجہ تھی کہ ایک عظیم المرتبت اور عالمگیر شہرت رکھنے والا شاعر اور فلسفی، جس کی تعلیم وطنیت اور ذات پات کی تمیز سے بالا تر تھی، ایک محدود خطہ کے مسلمانوں کی زبوں حالی اور مظلومیت کی داستانیں سن کر تڑپ اٹھا اور کہا :-

توڑ اس دست جفا کش کو یارب جس نے
روح آزادیٔ کشمیر کو پامال کیا

یا یہ کہ ظالموں سے باز پرس کرنے والی ہستی اپنی گرفت مضبوط کیوں نہیں کرتی اور قیامت کے دن کے لمحے نزدیک کیوں نہیں آتے۔

آہ ! یہ قوم نجیب و چوب دست و تر دماغ
ہے کہاں روز مکافات اے خدائے دیر گیر ؟

در اصل وطن سے محبت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے پھر اقبال اس جذبے سے کیونکر خالی رہ سکتے تھے۔ اسی جذبے کے ماتحت ان کا دل ہندوستان اور کشمیر کی تباہی پر کڑھتا تھا اور وہ اپنے خیالات کے اظہار پر مجبور ہو جاتے تھے اور کبھی کبھی رزم سیاست کی کمان اپنے ہاتھ میں لے کر قوم کی رہبری اور راہنمائی کے لئے میدان کار زار میں کود پڑتے تھے۔